ا۔ف۔ندیم

جان ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم اور ڈاکٹر رفیع الدین کا نقطۂ نظر

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی مایۂ ناز تصنیف "تعلیم کے ابتدائی اصول" تعلیمی موضوعات پر ایک انقلابی پیش کش ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے قدیم نظریاتِ تعلیم کا ابطال کر کے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور رہروانِ تعلیم کے لئے ایک ایسی منزل متعین کر دی ہے جسے قبول کئے بغیر چارہ نہیں۔ چونکہ اس کتاب کے حصہ اول میں ڈاکٹر صاحب نے ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اسی لئے اس کو زیبِ عنوان بنا کر اس مضمون میں دونوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس کتاب کے دیباچہ کے آخر میں رقمطراز ہیں کہ

"یہ کتاب کسی خاص فرقے، قوم، مذہب، ملک یا مکتب فکر کے تقاضوں اور خواہشوں کو مدِّنظر رکھ کر نہیں لکھی گئی ہے۔ ہمارا مقصد یہ رہا ہے کہ انسانی فطرت کے قوانین کے تحت شخصیت کا موجس انداز سے ہوتا ہے اور ہونا چاہیے، اس کا مطالعہ جذبات اور اغراض سے الگ رہ کر کیا جائے۔ آدمی کہیں بھی ہو، اس کی فطرت ایک ہی ہے۔ لہذا ہر وہ انسانی ہستی جو چاہتی ہے کہ اسکی تعلیمی نمو صحیح سمت میں ہو اور منتہائے کمال کو پہنچے ایک ہی سے تعلیمی ضروریات رکھے گی اور ایک ہی طریقہ تعلیم مانگے گی۔ چاہے اس کی سکونت روس کی ہو یا امریکہ کی، انگلستان کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی اور چاہے وہ عیسائی ہو یا ہندو، مسلمان ہو یا کسی دوسرے مذہب کو مانتا ہو"۔

ان سطور سے اس منزل کی نشاندہی ہوتی ہے جسے ڈاکٹر صاحب تعلیم کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ وہی نصب العین ہے جس کی حقیقت کو راہنمایان تعلیم نہ پا سکے اور اسی وجہ سے ان کا فلسفہ بے جان اور بے حقیقت بن کر رہ گیا۔ اسی ضمن میں وہ ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔

ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم

جان ڈیوی بیسویں صدی کی ان فخر روزگار ہستیوں میں سے ہے جنہیں تعلیم کے میدان میں خاص امتیاز

اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ وہ نہ صرف فلسفی، ماہر اخلاقیات، ماہر نفسیات بلکہ فلسفہ تعلیمات کا درخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" افلاطون کی "ریاست" کے ہم پلہ خیال کی جاتی ہے۔ وہ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو برلنگٹن میں پیدا ہوا اور اپنی ابتدائی تعلیم نیو انگلینڈ اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر رہ

نظریہ عملیت (THEORY OF PRAGMATISM)

جان ڈیوی، ولیم جیمز کے نظریۂ عملیت سے کافی متاثر تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کسی شے کا معیارِ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق انسانی اغراض و مفاد سے ہو اور جو نظامِ عالم میں جاری ہو سکے وہ صحیح ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ابتدائی اسباب کے مطالعہ سے قطع نظر کر کے اس کے عملی پہلو اور نتیجہ کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ وہ حقیقت کی جستجو میں معقولات، اٹل اصولوں، کلیات ازلی اور ابتدائی اشیاء کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ صرف واقعات، تجربات و مشاہدات کو مشعلِ ہدایت بناتا ہے۔

ڈیوی کا میلان انسانی زندگی اور جدوجہد کی طرف ہے۔ جو تحقیق و تفتیش اور تجربہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کے نزدیک اصول اٹل اور ابدی نہیں ہونے چاہیئیں بلکہ مفروضہ دعویٰ ہونے چاہیئیں تاکہ وہ برابر آزمائے جا سکیں اور ان میں وقتاً فوقتاً امتدادِ زمانہ کے مطابق تغیر و تبدل کیا جا سکے۔

اس کے نزدیک جمہوریت، فرد کی مکمل نشو و نما اور ارتقا کا بہترین ذریعہ ہے۔ نظریۂ عملیت کے تحت وہ علم کو اخلاق سے جدا نہیں سمجھتا۔ اس کے فلسفہ کا صحیح نظریہ تعلیمی نظریہ میں پنہاں ہے۔ حقیقت یہ ہے وہ فلسفہ و تعلیم کے تعلق کو زندگی کی نشو و نما اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتا ہے۔

غرض ڈیوی کے تمام فلسفہ کی اساس تجربہ و مشاہدہ پر ہے۔ وہ تعلیم کو نشو و نما کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں تعلیمی طریق در روشِ تجربہ کی متواتر تعمیرِ نو کا نام ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ تجربہ بہترین معلم ہے لیکن یہ رائے صائب نہیں کہ علم ایامِ زندگی کے گزرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مدرسے کا فرض یہ ہے کہ وہ تجربہ میں طالب علم کا ہاتھ بٹائے بلکہ علم کو اس کے دوش بدوش کافی سرعت کے ساتھ چلنے دے تاکہ زندگی کے اصل تجربات سے روشناس ہو کر شمعِ راہ کا کام دے۔ کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر انسان تجربہ سے مختلف سبق حاصل کرتا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کو زندگی میں

اوّل سے آخر تک یک رنگی اور جمود معلوم ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے لئے زندگی ہر روز ایک نیا علم و پیغام لاتی ہے اور ان کے خزانۂ دانشمندی میں اضافہ کرتی ہے۔

ایسا اختلاف کیوں ہے ؟ کیا یہ فطری قوتوں کے باعث ہے یا تعلیم کے اختلاف کا نتیجہ ہے ؟ ڈیوی اس کے جواب میں اپنی تصنیف "جمہوریت و تعلیم" میں لکھتا ہے۔ "تجربہ کی ماہیت کو یوں سمجھئے کہ وہ حرکت و جمود کے عناصر کا مجموعہ ہے۔ تجربے کا حرکی یا عملی پہلو سعی و کوشش ہے۔ جس کی مکمل تشریح دار التجربہ یا معمل کا عمل اور تجربہ ہے۔ جمودی پہلو مصائب و آلام کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ جب ہمیں کسی شے کا شعور یا تجربہ ہوتا ہے تو وہ اس پر عمل کرنے کا محرّک ہوتا ہے اور ہمارا عمل کسی نہ کسی طرح اس سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر ہم پر اس کے نتائج کا اثر ہوتا ہے۔ ہم اس چیز پر اثر ڈالتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ تجربہ کے ان دونوں پہلوؤں کا اتصال و ربط اس کی قدر و مفاد کا معیار ہے۔ صرف عمل و حرکت ہی کا نام تجربہ نہیں ہے۔ وہ تجزیہ کرنے اور انتشار کو ایک مرکز پر لانے کا نام ہے۔ تجربہ بامعنی جدوجہد تغیّر و تبدّل کو اپنے ہمراہ لاتا ہے۔ لیکن تغیّر ایک بے معنی سی حالت ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ ان نتائج کا احساس نہ ہو، جو اس سے وابستہ ہیں۔ جب کوئی عمل نتائج کے معلوم کرنے میں مسلسل جاری رہتا ہے اور جب عمل کا تبدّل ہم میں تغیّر پیدا کر دیتا ہے تو مسلسل حرکت بہت پُرمعنی ہو جاتی ہے۔ اسی وقت ہم کچھ سیکھتے اور حاصل کرتے ہیں۔

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق تجربہ سعی و جدوجہد نتائج کے برداشت کرنے اور ان دونوں کے تعلقات کے پہچاننے پر مشتمل ہے۔ اس میں حیات کا تسلسل اور اتحاد شامل ہے۔ پیہم اور منتظم عمل ایک غیر مربوط اور کورا نہ لائحۂ عمل سے مختلف ہے۔ اور جو کام آزمودہ ہو وہ عملی اقدام میں برابر معین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمل افزائش پذیر ہے اور ہر ذمہ دار عمل اور کام کے لئے ہم کو ہمیشہ آزمودہ نتائج کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

ڈیوی لکھتا ہے کہ علم کا فرض ہے کہ وہ ایک تجربہ سے دوسرے تجربوں میں پوری طرح فائدہ پہنچائے۔ ایک مکمل علم تعلقات کی ایسی منظم و مسلسل کڑی پیش کرتا ہے کہ پُرانے تجربات کی روشنی میں نئے تجربات سے پوری طرح سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور مشکل حل بآسانی دریافت کیا جا سکتا ہے۔

ڈیوی کے نظریات کے مطابق مدرسہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تجربات کو مہیّا اور فراہم کرے جو تعلیمی اقدار رکھتے ہیں۔ تاکہ تمام طلباء اپنی استعداد و قوت کے مطابق علم حاصل کر سکیں۔ وہ مدرسہ کو قومی یا اجتماعی زندگی کے مشابہ خیال کرتا ہے جہاں معاشرہ کو ترقی دے سکیں۔ مدرسے کو لازم ہے کہ وہ اپنی اندرونی زندگی کی تکمیل

ملاعاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرے اور ایسے مواقع بہم پہنچائے جن سے فائدہ حاصل کر کے بچے اجتماعی مشاغل و
مقاصد کو سمجھ لیں اور ایک حد تک اس میں حصہ لے سکیں۔ اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے ربط و تعلق نہیں رکھے گا
تو وہ معاشری زندگی کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا اور جو کچھ علم و ہنر، لیاقت و استعداد بچے وہاں حاصل کریں
گے۔ وہ اس کی چار دیواری تک محدود رہیں گے۔ اور جب وہ اس چار دیواری سے باہر نکلیں گے تو اس سے
کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔

اس کی رائے میں مدرسہ ایک مخصوص ماحول کا نام ہے جو معاشرہ کا پیدا کردہ ہے۔ اور جہاں بچوں کے ذہنی
اور اخلاقی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے اور جہاں ان کی جبلتیں انفرادی نشوونما کے مطابق ڈھالی جاتی ہیں اور
جہاں ان کو اجتماعی مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ ڈیوی نے اس ماحول کی تین خصوصیات بیان
کی ہیں۔

(ا) مدرسہ کا ماحول ایسا ہو کہ جدید تہذیب و تمدن کے پیچیدہ مسائل و عناصر زیادہ سہل و آسان طور پر بچوں
کے سامنے پیش کئے جائیں۔ کیونکہ بچے بغیر تمثیل کے بآسانی سمجھ نہیں سکتے۔ مدرسہ کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ
بچوں کے لئے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت
رکھتے ہیں۔ اور جن کو نوعمر طلبا سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرے۔
ابتدا میں آسان چیز سکھائے اور ان کی مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل امور کی تشریح کرتا رہے۔

(ب) دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب و تمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جائیں جو
بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں۔ اصلاح و ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب
کی جائیں جو صریحاً مفید ہیں اور مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلیٰ تر معیار تمدن
سے روشناس کردے گا۔ اور وہ بڑے ہو کر معاشرے کے مُضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح
کر سکیں گے۔

(ج) تیسری خصوصیت مدرسے کے ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب عناصر ایک خاص توازن
اور ہم آہنگی کے ساتھ مرتب کئے جائیں۔ تاکہ تمدنی زندگی میں مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں
نوعمر بچے جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے
قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بے بہرہ نہ ہو جائیں۔ لہٰذا اس مدرسے میں کسی فرقہ پرستی کی تنگ فضا کی جگہ

وسیع قومی روایات کا وسیع تر ماحول بہم پہنچانا چاہیئے اور اس کو اتنا وسیع و فراخ بنانا چاہیئے کہ اس میں آفاقی انسانی تمدّن کی رُوح پیدا ہو جائے۔ اس طرح افراد میں ہم آہنگی وسیع النظری اور یکسانیت پیدا ہو جاتی۔ معیاری نمونے کا مدرسہ محض مثالی گھر ہے۔ جو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ تمام فرائض جو ادنیٰ معیا پر گھر میں انجام دیئے جاتے ہیں اور جن کی ضرورت جدید صنعتی و اقتصادی نظام کے اتفاقات میں برابر بڑھتی رہتی ہے باضابطہ و منظم طور پر انجام دے سکیں۔

عمرانی و اجتماعی تنظیم نو

ڈیوی کا خیال ہے کہ اگر معاشرہ کو ترقی پذیر ہونا ہے تو تجربہ کی انفرادی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اجتماع تنظیم ناگزیر ہے۔ بچوں کی تعلیم معاشرہ کی مسلسل حیات کا ذریعہ ہے لیکن وہ معاشرے جو تعلیم کا واحد مصرف اپنی حیات کی بقاء، تعمیر عمرانی کا افادہ اور افزائش نسل کو تصوّر کرتے ہیں وہ حالتِ جمود میں رہتے ہیں ایک حرکی معاشرہ کا کچھ اور ہی فرض ہونا چاہیئے۔ اس لئے لازمی ہے کہ وہ ایسی تعلیم دے جو تغیّر پذیر معاشر نظام آنے والے واقعات کی رہبری کرے تاکہ معاشرہ مستقبل، موجودہ معاشرہ سے بہتر اور اعلیٰ ہو جائے۔

ڈیوی اپنی تصنیف "انسانی فطرت و روش" میں لکھتا ہے کہ حالات جدید کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مسلس تدریجی، معاشی اور عمرانی اصلاح کا خاص ذریعہ بچّوں کو تعلیم دینے کے مواقع کا استعمال کرتا ہے تاکہ مروّجہ خیالا و خواہشات کو برتر و پاکیزہ کیا جا سکے۔ بچے اس زمانہ میں مقررہ رسوم و روایات سے پوری طرح متاثر نہیں ہو ان کے غیر ارادی مشاغل زندگی، تغیر پذیر، آزمائشی شوقی اور استعجابی ہوتے ہیں۔ بالغوں کی عادتیں مقابلتہً متین مستحکم و پختہ ہو جاتی ہے۔ گردوپیش کے حالات و واقعات سے ان کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ البتہ وہ انتہا کوشش و جد وجہد سے تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ واضح طور پر ضروری اور احتیاجی تبدیلی کا شعو و احساس کرنے سے قاصر ہوں۔ یا ان کے نقصانات کے برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ لیکن وہ آئندہ نس کے لئے بہتر و مختلف زندگی کی تمنا کرتے اور خواہشمند ہوتے ہیں۔

لیکن نامعلوم مستقبل کے لئے تعلیم و تربیت دنیا کیسے ممکن ہے؟ تعلیم اطفال لازماً بالغوں کے ذمہ ہوتی جن کی عادات و قوت فکر یہ قریب قریب مستحکم و پائدار ہو چکے ہوتے ہیں۔ عادات دائمی و استمرانی راہ کو اختیار ک ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم بدبختی کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اخلاق و سیرت کی تخریب ہوتی ہے۔ سوال

ہے کہ درسی اداروں میں انقلاب پیدا کرنے اور ان مقاصد کی تکمیل کے وسائل حاصل کرنے کی کون سی راہیں ہیں؟

ڈیوی اس سوال کا جواب حسب ذیل الفاظ میں دیتا ہے۔

"تعلیم اطفال کو بار آور بنانے میں تاکہ معاشرہ کی ترمیم و اصلاح ہو بالغوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی برتر و بہتر ریاست کا مدون و باضابطہ نصب العین پیش نظر رکھیں۔ اگر کسی تعلیمی نہم میں یہ مُدرج جاری ہوگی تو وہ یقیناً اپنی غیر متحرک اصلی حالت پر قائم رہے گی۔ اور اس کا انجام تشدد میں ہوگا۔ ہمارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان عادات و خصائل کی تشکیل و تعمیر کی جائے جو مروجہ خصائل سے زیادہ ذکی و زیرک، قوی الادراک، زود فہم، و دُور اندیشی میں ڈوبے ہوئے ہست لو دسے زیادہ واقف کار، زیادہ خالص و غیر مبہم زیادہ دُور رس اور اثر پذیر ہوں۔ ایسی صورت میں وہ نئے اور دشوار امور سے دوچار ہوں گے اور ان کے حل و اصلاح کی خود ہی سوچ و بچار کریں گے۔ اس کے علاوہ تغیر پذیر معیار و اقدار کے باعث سماج کی مسلسل تعمیر نو کرنا انقلاب کی تخریب سے روکنے اور حصول استحکام کا واحد طریق عمل ہے انتہائی جمود و غیر معقول سکون باغی و سرکش پیدا کرتا ہے۔ زندگی کی بقا تجدید و تعمیر پر قائم ہے۔ اگر حالات مسلسل تنظیم و تشکیل کے لئے نامساعد ہیں تو اس کا اچانک وقوع پذیر ہونا کسی نہ کسی وقت لازمی ہے انقلابات کے رونما ہونے کے ذمہ دار وہ لوگ ٹھہرائے جائیں گے۔ جو ہم آہنگی اور تطبیق کے بجائے رسوم کی بقا کو اپنا مطمح نظر رکھتے ہیں۔

بقول ڈیوی تعلیم اور جدید تمدنی زندگی کا باہمی ربط و تعلق بے حد ضروری ہے۔ وہ روسو کو تعلیم جدید کا پہلا اور سب سے بڑا پیغمبر مانتا ہے۔ اس کے نزدیک رُوسو کی حقیقی عظمت اور حکمت کا راز یہی ہے کہ اس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو پورے طور پر سمجھ لیا کہ خواہ تعلیم کا مقصد اعلیٰ کچھ ہو اس کا نقطۂ آغاز بچے کی شخصیت و ذات ہے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رجحانات کا احترام اور ان کی ہدایت معلم کا اوّلین فرض ہے تعلیم کا مقصد اولیٰ صرف یہ ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کیا جائے لیکن اس کے یہ بھی معنی نہیں کہ ہم بچّوں کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ نہ دیکھنے دیں اور ان کو ان فرائض و ذمہ داریوں کے لئے تیار نہ کریں جن سے ان کو مستقبل میں دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینا غیر مفید عملی نتائج پیدا کرے گا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ دیکھا گیا ہے کہ معلّم بجائے اس کے کہ بچّوں کی موجودہ ضرورتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے انہوں نے مستقبل کی ضروریات کو اپنا نصب العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا۔ اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود

تو بلوغ کی زندگی ہے۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں۔ وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی اہم اور قابلِ توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اس کے نشو ونما کے ہر ہر قدم کو اس کے لئے معنی خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے۔ اس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ معلّم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نوعمر بچّہ ایک مخصوص شخصیت کا مالک ہے۔ انواع واقسام کی بیش بہا قوتیں اور استعدادیں اس میں موجود ہیں۔ وہ مخصوص شوق ورجحانات کا مالک ہے جس کا دریافت کرنا اس کا فرضِ اوّلین ہے اور جن کی تربیت اور ترقی کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اس کا خاص کام ہے۔

ڈیوی رُوسو کے مندرجہ ذیل خیالات کی تائید کرتے ہوئے۔ اس کی کتاب ریمیل کا اقتباس اپنی کتاب (SCHOOL OF TOMORROW) سکول آف ٹو مارو میں نقل کرتا ہے۔

"ہمارا فرض ہے کہ ہم بچّوں کو ایسی چیزیں پڑھانے اور سکھانے کی کوشش کریں جو اُن کے لئے بہ حیثیت بچّے کے مفید ہیں۔ اور اگر ایسا کیا جائے تو بچّے پورے انہماک سے سارا وقت صرف کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو اس عمر کے لئے تعلیم وتربیت دیں جس عمر تک وہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے؟ اور اس تعلیم وتربیت کو پسِ پشت ڈال دیں جو اس کی موجودہ ضروریات کے پورا کرنے میں ممد ومعاون ہو لیکن سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس کی تحصیل بے محل اور بے وقت ہو گی جبکہ اس کو ضروریات استعمال کا وقت آن پڑے۔ روسو لکھتا ہے کہ میں اس کے جواب دینے سے قاصر ہوں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کا قبل از وقت سکھانا ناممکن ہے۔ کیونکہ ہمارا اصل معلّم تجربہ اور شعور ہے اور ایک بالغ آدمی اپنی ضروریات وحوائج کو کبھی نہیں سیکھ سکتا جب تک کہ اس کو ان حالات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔"

ڈیوی کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد نہیں وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعے سے انسان میں علمی اخلاقی معاشرتی نشو ونما کی قوت زیادہ ہوتی جائے اور اس کی مجموعی شخصیت کا ارتقاء برابر جاری رہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر تعلیم کا منتہائے مقصود یہ ہو کہ بچوں کی تمام موجودہ فطرتی قوتیں رجحانات جبلتیں شوق اور دلچسپیوں کو بیدار کیا جائے اور ان کی باقاعدہ تشکیل کی جائے تو یقیناً طلبا کی زندگی بدرجہا بہتر ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ مستقبل کے لئے مکمل طور پر تیار ہو جائیں گے۔

لیکن دماغی واخلاقی ارتقائی برتری اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب طلبا خود بالارادہ اور اختیاری طور پر عملی قدم اٹھائیں۔ ڈیوی لکھتا ہے۔

"سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے یا نہیں۔ اگر تعلیم کے معنی نشوونما کے ہیں۔ تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو بتدریج قوت سے فعل میں لائے۔ اور اس طرح افراد میں آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے نشوونما کوئی ایسی چیز نہیں جو یوں ہی کبھی کبھی واقع ہوجایا کرے۔ وہ برابر رفتہ رفتہ موجودہ کیفیت سے مستقبل کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ اگر مدرسہ کا ماحول اور خارجی حالات ایسے ہیں جن میں بچّوں کی موجودہ صلاحیتوں کو مناسب طریقہ پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔ تو مستقبل جو حال ہی سے پیدا ہوتا ہے خود بخود بہتر اور خاطر خواہ صورت اختیار کرے گا۔ غلطی یہ نہیں کہ بچّوں کو مستقبل کے لئے تیار کرنے پر زور دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش کا مرکز قرار دیا جائے۔ چونکہ واقعتاً یہ بات بہت اہم ہے کہ نوعمر طلبہ کو اس زمانے کی زندگی کے لئے جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار کیا جائے اس لئے لازم ہے کہ ان کے موجودہ تجربات کو معنی خیز بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتے۔ اس طرح غیر محسوس طریقہ پر حال مستقبل کی فکر خود بخود کرے گا۔"

یہ ہے ڈیوی کے فلسفۂ تعلیم کا مختصر خاکہ۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے اس فلسفۂ تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم دیگر راہنمایانِ تعلیم کے فلسفۂ تعلیم کی طرح ناقص ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے جو تنقید کی ہے اس کو سمجھنے کے لئے ان کا تعلیم کے بارے میں نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔

"ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک مکمل نظامِ تعلیم وہی ہوسکتا ہے جو قوم کو ایک مکمل نصب العین دے سکے اور یہ مکمل نصب العین وجودِ خداوندی پر یقین کامل ہے جب کسی قوم کو خدا سے محبت ہوجاتی ہے تو اس کے افراد میں اعلیٰ ترین دماغی روحانی اور اخلاقی صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک ناقص نصب العین ناقص نظامِ تعلیم کو جنم دیتا ہے اور ناقص انسان پیدا کرتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ نصب العین کی تلاش اور اس تک پہنچنے کی آرزو خاصہ فطرتِ انسانی ہے بچے کو جو تعلیم دی جاتی ہے حیوانی تقاضوں مثلاً حفظِ جان و افزائش نسل کی خاطر نہیں دی جاتی یہ تقاضے جسم کے تقاضے ہیں اور جسم خود ہی ان کی تکمیل کی راہیں تلاش کر لیتا ہے تعلیم کا مقصد اس تقاضے کی تسکین ہوتا ہے جس کا تعلق عین ذاتِ انسانی سے ہے۔ اور وہ تقاضا نصب العین کی طلب ہے۔ اسی تقاضے کو تعلیمی نمو کا تقاضا کہا گیا ہے۔ یہی وہ تقاضا ہے جو جسم کا نہیں بلکہ نفس اور رُوح کے ارتقار کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہمارے زندگی کا نصب العین ہی یہ ہے کہ ہم عرفانِ ذات اور عرفانِ کائنات حاصل کر کے اپنے حقیقی نصب العین کی طرف گامزن ہوں۔ ان کے نزدیک جو زندگی کا نصب العین ہے وہی تعلیم کا نصب العین ہے۔ فطرتِ انسانی یکساں ہے لہذا ہر انسان کی فطرت کے موجب تعلیمی نصب العین بھی ایک ہی ہوگا فرماتے ہیں کہ انسانی شعور کا یہ تقاضا ہے کہ کسی نصب العین سے جو بدرجہ اعلیٰ و اکمل و احسن ہو محبت کی جائے یہی وہ خاصہ ہے جو انجام کار انسان کی تمام خواہشات اور سرگرمیوں پر مسلط اور حکمران ہو جاتا ہے ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ میکڈوگل، فرائڈ، اڈلر اور مارکس کے نفسیاتی نظریات سے متعارض ہے لیکن ان کا یہ دعویٰ حقائق پر مبنی ہے۔ نصب العین سے محبت انسان کا فطری تقاضا ہے لہذا ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ متذکرہ بالا ماہرین نفسیات کے نظریوں سے ہم آہنگ نہ سہی قرآن حکیم (جو دینِ فطرت کی کتاب ہے) سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اسی نصب العین کا تذکرہ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن : جن و انس کی زندگی کا نصب العین خالقِ کائنات کی معرفت حاصل کرنا اور اس کے حکم پر عمل پیرا ہونا ہے۔

دوسرے مقام پر قرآن حکیم نے اس کی تعبیر کے لئے یہ اندازِ بیان اختیار کیا۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَہ الْقُرْاٰن خَلَقَ الْاِنْسَان عَلَّمَہ الْبَیَان رحمٰن ہی نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کرنا سکھایا۔ رحمٰن و رحیم کو انسان کی تخلیق سے محض یہ مطلوب تھا کہ وہ ہمہ تن قرآن کی تعلیم و تعلّم میں منہمک رہے۔

مقصد تعلیم متعیّن کرتے ہوئے قرآن حکیم نے واضح طور پر لِیَتَفَقَّھُوْ فِی الدِّیْن کے الفاظ استعمال کئے اور اس کی غرض و غایت دین کا فہم و شعور حاصل کرنا بتایا ہے۔ ان آیاتِ ثلاثہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کا مقصدِ حیات خالقِ کائنات کی

معرفت[1] حاصل کرنا اور اس کے احکام و فرامین پر عمل پیرا ہونا ہے لیکن ان احکامِ خداوندی اور فرامین ․․․ ․․․ ربّ العالمین پر عمل کرنے کے لئے علم و آگہی بھی ضروری ہے ․ علم کے بعد ہی اس پر عمل کی نوبت آتی ہے اس لئے تیسری آیت میں ان دونوں کو جمع کرتے ہوئے مقصدِ تعلیم کا اظہار فہمِ دین[2] کے ساتھ کیا گیا ․ نظامِ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جس نظریۂ زندگی کے ماتحت وہ وجود میں آیا ہے اس کی محبت کو نقطہ کمال پر پہنچائے اور دوسرے مخالف تصوّرات کی محبت کو کلیتاً مٹا دے ۔

نصب العین سے محبت اس کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں ․ مندرجہ ذیل آیہ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل علم وہ ہیں جنہیں اپنے نصب العین کا پورا علم یا معرفت حاصل ہے ۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳ : ۱۸)

اللہ گواہی دیتا ہے کہ بجز اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور اہل علم بھی اس کی شہادت دیتے ہیں اور وہ منتظم عادل ہے ․ اس زبردست حکمت والے کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے ۔

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں !

اس آیت میں اہل علم سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی وحدانیت کو دلائل قطعیہ سے پہچانا کیونکہ وہی شہادت مقبول ہے جس کا تعلق علم کے ساتھ ہو[3]

ع۱ : واضح رہے کہ آیہ مذکورہ بالا میں یعبدون میں لیعشقون اور لیعرفون کا مفہوم مضمر ہے ۔

ع۲ : دین نہایت جامع لفظ ہے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو دین کے دائرہ سے خارج ہو اس لئے قرآنِ حکیم انسان میں دینی شعور کے وجود کو ضروری قرار دیتا ہے تاکہ وہ نصب العین حیات کو زندگی کے تمام شعبوں میں جاری وساری کر سکے ۔

ع۳ : تفسیر کبیر جلد دوم ص ۴۱۵ ․ ملّا حسین واعظ کاشفی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں ۔

گفتہ اند شہادت حق نصبِ دلائل است بر توحید و شہادت ملائک بوحدانیت و گواہی علما فی ایمان بدان و احتجاج بر آن و فضیلتِ علماء و شرفِ ایشان از اقتران شہادت ایشان با شہادت حق معلوم مے تواں کرد ۔ (تفسیر حسینی ص ۶۲ جلد ۱)

(ترجمہ) کہا جاتا ہے کہ حق تعالےٰ کی گواہی کا مطلب توحید پر دلائل قائم کرنا ہے اور ملائکہ کی گواہی اس کی وحدانیت کا اقرار کرنا اور علماء کی شہادت اس پر ایمان لانا اور اس سے حجت پکڑنا ہے

ان تصریحات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ نصب العین کا عرفان اور اس سے محبت اہلِ علم ہی کا حصہ ہے بالفاظِ دیگر علما وہ ہیں جنہیں اپنے نصب العین کی معرفت حاصل ہے اور اس معرفت کی بنا پر وہ اس سے محبت کرتے ہیں قرآن کریم کی رُو سے وہ شخص اہلِ علم سے نہیں جس کو نصب العین کی معرفت (معرفتِ حق) نہیں اور جو اس کی محبت سے محروم ہے۔

اندازہ کیجئے کہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا تصوّرِ علم قرآنی نظریۂ علم سے کس قدر ہم آہنگ ہے اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کا یہ فلسفۂ تعلیم کسی مخصوص طبقہ یا مذہب کی رو سے پیش نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تعلیم از خود ہونے والا فطری نمو ہے جو داخلی طور پر کام کرتا ہے بالفاظِ دیگر تعلیم خود فرد کے نمو سے عبارت ہے جب تک یہ نمو پانے کا خلقی تقاضا اور تڑپ کسی ذی حیات میں موجود نہ ہو اس وقت تک نشو و نما کا عمل ساقط ہی رہے گا۔

غرض ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کے اندر تعلیمی نمو کے لئے ایک خلقی تقاضا پایا جاتا ہے اور تعلیم کے اعتبار سے کسی شخص کا کمالِ نمو کو پہنچنا منحصر اس امر پہ ہے کہ وہ اس تقاضے کا مظاہرہ اور اس کی تشفی بدرجہ اتم کر سکا ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب دینی اور دنیوی علوی علوم کے درمیان کوئی خطِ فاصل نہیں کھینچتے اور نہ وہ تعلیم کو صرف سماجی مسئلہ ہی سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ علوم کی سرحدیں جو ہم قائم کرتے ہیں صرف ہمارے اندازِ فکر کی پیداوار ہوتی ہیں کائنات کی حقیقتیں اس طرح خلط ملط ہیں کہ بٹوارہ نہیں ہو سکتا۔ دینی اور دنیوی علوم کی تفریق خود ساختہ اور پُر فریب ہے کوئی خطِ تقسیم علوم کے درمیان ایسا نہیں ہے جو بعض کو دینی اور دوسروں کو دنیوی کہنے کا جواز فراہم کر سکے۔ نہ انسان کی شخصیت کے دو ٹکڑے کئے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک دنیوی ہو اور دوسرا دینی ہو۔

ڈاکٹر صاحب کا فلسفۂ تعلیم حقیقتِ کائنات اور حقیقتِ بشر کے فلسفے سے شروع ہوتا ہے یہ مباحث مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کے مخصوص مباحث ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ارتقائی تغیرات مادے کے کرشمے نہیں بلکہ ارتقا کا عمل باطنی تقاضے کا عطیہ ہے جس کو تقاضائے نمو کہا گیا ہے۔ انسانی منزل پر پہنچ کر یہ تقاضائے نمو خالص نفسیاتی نمو کا تقاضا بن جاتا ہے جو عبارت ہے نصب العین کی تلاش سے۔ یہ نصب العین جیسا کہ گذر چکا ہے بجز ذاتِ حق کے کوئی اور نہیں ہو سکتی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مولانا رومؒ کے فکر سے بے حد متاثر ہیں۔ مولانا رومؒ کا نظریہ ارتقا ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

از جمادی مردم و نامی شدم   وز نما مردم بہ حیواں لرز دم
مرد از حیوانی و آدم شدم   پس چہ ترسم کے زمردن کم شوم

ڈیوی اور ڈاکٹر رفیع الدین کے ذہنی فاصلے

سطور مندرجہ بالا میں جان ڈیوی اور ڈاکٹر رفیع الدین کا فلسفۂ تعلیم بیان کرنے کے بعد دونوں کے فکر کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہیں تاکہ ڈاکٹر موصوف کو فلسفۂ تعلیم کے میدان میں جو امتیازی شان حاصل ہے اس کا کماحقہ اندازہ ہو سکے۔

ڈیوی اور ڈاکٹر رفیع الدین کے فلسفہ میں اگر کوئی اقدار مشترک ہیں تو وہ مندرجہ ذیل ہیں،

(الف) دونوں کا عقیدہ ہے کہ تعلیم انفرادی نہیں بلکہ سماجی طریق کار ہے جو کسی معاشر جماعت کو اپنا وجود قائم رکھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

(ب) معاشرے کی تشکیل ذہنی یکرنگی اور ہم خیالی سے ہوتی ہے جو افراد میں باہم پائی جاتی ہے۔

(ج) جماعت کے تمام عقائد اور خیالات کا محور یہ تخیل ہوتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی جماعت کو کن چیزوں میں خیر حسن اور صداقت نظر آتی ہے۔

(د) جماعت کے تمام افراد مشترکہ مقصد کا احساس رکھتے ہیں اس کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے اور اسی کے پیش نظر اپنی سرگرمیوں کو منضبط کرتے ہیں۔ مقصد ہی تمام اعمال واشغال پر فرماں روائی کرتا ہے۔

ہر جماعت ایک سماجی یا نفسیاتی ماحول قائم کر لیتی ہے اس ماحول کے توسل سے ارادی یا غیر ارادی طور پر عقیدے اور مقاصد منتقل ہوتے ہیں۔ اسی کے توسل سے جماعت کا ورثہ علم و دانش نسل بہ نسل تفویض ہوتا رہتا ہے یہ تفویض تعلیم کا ایک طریقہ ہے۔

ڈیوی کے نزدیک بزرگوں کے عقائد اور نظریات کو اپنا لینا قطع نظر اس سے کہ ان میں کوئی اخلاقی خوبی ہے یا نہیں تعلیم کا مقصد قرار پاتا ہے۔

"تعلیم یعنی عقائد اور مقاصدِ حیات کی تفویض میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز وہ عنصر ہوتا ہے جو درس

و تدریس کا مرہونِ منّت نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور کچھ سیکھنے کا لین دین کرنے سے پرورش پاتا ہے۔ تعلیم کا یہ واسطہ نامحسوس ہوتا ہے اور از خود کام کرتا ہے۔ لیکن جو کچھ اس واسطے سے ہم تک پہنچتا ہے وہی ہماری شعوری افکار و استدلال کی راہیں مقرر کرتا ہے۔ ہمارے استخراج کیے ہوئے نتیجے اسی کے فیصلے ہوتے ہیں"

"جماعت کے عقائد اور نصب العین جیسے ہوں گے ویسا ہی اس کا تعلیمی کام ہوگا لہذا جس جماعت کے عقائد و نظریات بہت اچھے ہیں اس کی تعلیم بھی جو اس نے رائج کر رکھی ہے بہت اچھی ہوگی"

یہاں تک ڈاکٹر رفیع الدین کو ڈیوی سے اتفاق ہے۔ لیکن بعد میں ڈیوی جب انہیں نظریات کی تردید شروع کرتا ہے تو دونوں کی راہیں متفاوت ہو جاتی ہیں مثلاً جب وہ یہ کہتا ہے کہ نمو کا یہ تصوّر بالکل غلط ہے کہ:

"وہ ایک پیش قدمی ہوتی ہے کسی منزلِ مقصود کی طرف۔ گویا لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر صورا کوئی مقصد رکھتی ہے۔ درآں حالیکہ وہ تو خود ہی اپنا مقصد ہے . . . . گمر بڑوں کا ماحول بچّوں کے لئے مثال سمجھا جاتا ہے اور ان کو اس طرح تربیت دینا ضروری بتاتے ہیں کہ اس مثالی ماحول کو اپنا لیں"

ڈیوی کا یہ بیان اس کے پہلے بیان کے بالکل خلاف ہے۔ پہلا بیان تو یہ تھا کہ تعلیم چونکہ ایک نموی عمل ہے اس لئے اس کا مقصد ہر جماعت کے لئے جدا ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچّوں کو سماجی سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ ان میں اور ان کے بڑوں میں ذہنی یکرنگی اور ہم خیالی پیدا کر دی جائے۔ اس تمام گفتگو کا کھلا ہوا مطلب یہ تھا کہ بڑوں کا ماحول بچے کے لئے مثال و معیار ہے۔

بقولِ ڈاکٹر رفیع الدین ڈیوی جب اس بات پر زور دیتا ہے کہ تعلیم کا کچھ مقصد ہونا چاہیئے تو گویا اپنے جدید موقف کی تردید شروع کر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم پانے والے کی تعلیم جاری رہے تعلیم کسی غایت کی تابع نہیں بجز اس کے کہ اور زیادہ تعلیم ملے۔ ڈیوی پھر لکھتا ہے۔

"مقصد میں لچک ہونی چاہیئے۔ یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ حالات کے مطابق بدلتا رہے مختصر یہ کہ مقصد آزمائش کے لئے ہوتا ہے جیسے جیسے آزمائش ہوتی جاتی ہے نمو پاتا رہتا ہے"

اس طرح ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے بڑی دقتِ نظر سے ڈیوی کے فلسفہ کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے نزدیک ڈیوی کا یہ خیال کہ سماجی نصب العین کی تہ میں حسن، خیر اور سچائی کا تصوّر ہوتا ہے درست ہے لیکن یہ خیال

کہ ہر قوم حُسن، خیر اور صداقت کا الگ الگ تصوّر رکھتی ہے، قطعی طور پر درست نہیں۔ ان کے نزدیک جس نصب العین میں یہ خوبیاں موجود ہیں وہ مختلف نہیں بلکہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے ذاتِ حق جس میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کا فلسفۂ تعلیم

جب ہم ڈاکٹر رفیع الدین کے فلسفۂ تعلیم کا اقبال کے فلسفۂ تعلیم سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے فکر میں تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے برعکس اقبال کے فکر میں فلسفہ و حکمت کا رنگ چھلکتا نظر آتا ہے۔ اقبال کے فکر کا خاص محور ان کا فلسفۂ خودی ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت کی تکمیل خودی کے پیدا ہونے کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ اسی لیئے علّامہ نے تعلیم کا اصل مقصد خودی کی نشوونما قرار دیا ہے۔ جیسا کہ "ضرب کلیم" میں "تعلیم و تربیت" کے عنوان سے تعلیم کا مقصد بیان کیا ہے۔ پہلے حکماء کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

اسپنوزا:۔ نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانش مند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور نور و وجود

افلاطون:۔ نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانش مند
حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

لیکن اقبال کے نزدیک ——————

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال کہتا ہے نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جس میں دین و اخلاق اور صفت کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو، اور ان کو تعلیم کا ایک ضروری جز قرار دیا جائے۔ فرماتے ہیں ؎

بہ پور خویش دین و دانش آمیز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدستِ اُو اگر داری ہنر را
ید بیضا است اندر آستینش

اقبالؔ علم کے ساتھ عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں جسے وہ زندگی عشق اور دوسرے مختلف الفاظ
تعبیر کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اہل نظر کو اہلِ دانش پر فضیلت حاصل ہے۔"تربیت" کے عنوان سے
علامہ نے اپنے فکر کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذّت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

زندگی اور علم کے تجزیہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علم بجائے خود کوئی ضروری شے نہیں بلکہ علم و زندگی کے ایک
حسین امتزاج کی ضرورت ہے ؎

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیمؑ
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

علامہ کے نزدیک وہ علم جو صرف سوزِ دماغ کا نتیجہ ہو اس سے انسانیت کی وہ تعمیر نہیں ہو سکتی جو
علم کا اصل مقصد ہے۔اس مقصد کے حصول کے لئے ذاتِ باری تعالےٰ کو بھی حقیقی نصب العین ماننا ضروری
ہے۔علامہ اس کا جا بجا اظہار فرماتے ہیں۔

خودی را از نمودِ حق نمودے　　خودی را از وجودِ حق وجودے
نے دانم کہ ایں تابندہ گوہر　　کجا بُودے اگر دریا نبودے

اقبال اسی نصب العین کی آرزو کرتے ہیں ؎

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزوست

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوبتر نگارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دِلِ اُمیدوارے

ڈاکٹر رفیع الدین کا نصب العین (ذاتِ حق) وراء الوریٰ ہے۔ اقبال بھی حقیقت کے ماورائی پہلو پر ہی زور دیتے ہیں۔ جیسا کہ اشعار متذکرہ بالا سے ظاہر ہے۔ لیکن نصب العین کا یہ تعین اقبال کے ہاں بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس مقام پر اقبال ڈاکٹر رفیع الدین کی نسبت زیادہ صوفی بلکہ صوفیاء وجودی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ذاتِ حق کو منزّہ نہیں بلکہ مشتبہ تصور کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اقبال جب معروض سے ہٹ کر موضوع کی طرف آتے ہیں تو ان کا تصورِ توحید بدل کر توحیدِ وجودی ہو جاتا ہے۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

؎ ہست معشوقے نہاں اندر دلت　　چشم اگر داری بیا بنمائمت
خود را کُنم سجودے دیر و حرم نماندہ　　آں در عرب نماندہ ایں در عجم نماندہ

باقی صـ۷۱ پر